جماعت اسلامی پر الزامات

اور

ان کا جواب

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"یہ مضمون ترجمان القرآن جلد ۳۵۔۳۶، عدد ۵۔۶ میں مولانا عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا جس میں موصوف نے جماعت اسلامی پر بعض الزامات عائد کیے تھے۔ ترجمان میں ہم نے اس کے ساتھ مولانا عبدالرشید محمود صاحب کا مضمون بھی دے دیا تھا لیکن اس مجموعہ میں طوالت سے بچنے کے لیے ہم نے اس کو حذف کر دیا ہے۔ ان کے اعتراضات والزامات ہمارے جواب سے خود واضح ہو جائیں گے"

اس تحریر میں جماعت اسلامی پر جو الزامات عائد کیے گئے ہیں ان پر گفتگو کرنے سے پہلے میں صاحب تحریر بزرگ اور ان کے انداز پر سوچنے والوں کے اس عجیب وغریب طرز فکر پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ حضرات مبتلا ہیں۔

ایک طرف تو یہ حضرات ایک شخص کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کی تحریریں سلف کی "تنقیص وتحمیق" اور "اپنی تصویب وتوثیق اور اعجاب رائے" کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کی دعوت اور اس کے لٹریچر سے "ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا۔" ایک طرف تو ایک شخص کی تحریروں کا نتیجہ ان حضرات کے خیال میں یہ نکل رہا ہے کہ "لوگ سوادِ اعظم سے کٹتے جا رہے ہیں۔" دوسری طرف اسی شخص کی تحریروں کی یہ برکت بھی بیان کی جا رہی ہے کہ "وہ اس طبقے کے ریب وتشکیک یا جمود و

انکار کوتصدیق واثبات کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہے جو الحاد کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔“ ایک طرف تو پوری جماعت کی جماعت کے علم وفضل پر ان کا یہ تبصرہ ہے کہ ”ان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم وتفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو۔“ دوسری طرف اسی جماعت کی نسبت یہ ارشاد بھی ہے کہ ”دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم جو تحریکیں آج چل رہی ہیں اور قومیت، وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آرہی ہیں ان کے مقابلے کے لیے وہ پوری طرح مستعد ہے۔“ اور ان سب سے عجیب تربات یہ ہے کہ ایک شخص کو یہ حضرات ایک مفسر، ایک محدث، اور ایک فقیہہ کی حیثیت سے تو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن اگر وہی شخص ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان کے سامنے آئے تو اس کو اپنا قائد بنا لینے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

فکر ونظر کا یہ انتشار ایک طرف تو ان حضرات کی بہت بڑی نفسیاتی کمزوری کا پتہ دے رہا ہے، دوسری طرف اس سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے تعلق ان کا تصور اس تصور سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو عیسائی اپنے مذہب کے متعلق رکھتے ہیں۔

ان کی نفسیاتی کمزوری تو یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی سے ان لوگوں کو جو خلش ہے وہ اس بات کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کے ہاتھوں اسلام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے، بلکہ ساری خلش اس بات کی وجہ سے ہے کہ مولانا مودودی کی تحریروں اور جماعت کی دعوت سے خود ان کے اپنے حلقہائے عقیدت بھی متاثر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اگر ان حضرات کو اس بات کی طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ان کے اپنے حلقے جماعت کی اثر اندازیوں سے محفوظ رہیں گے تو پھر مولانا اور ان کے رفقاء جو چاہیں کرتے پھریں، انشاءاللہ سب خیر وبرکت اور خدمت واعانت دین ہی ہے۔ ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ جو شخص ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں میں ایک نئے فرقے کی بناڈال رہا ہے، جو کتاب وسنت اور سلف کے استنباطات پر نظر نہ رکھنے کے باوجود بھی اجتہاد کا زعم رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے دماغ میں بھی

اجتہاد کی ہوائے خودسری بھر رہا ہے، جس نے تصوف واحسان اور اس کے اساطین وعمائد کے خلاف لوگوں کے اندر نفرت وتحقیر کے جذبات پیدا کیے ہیں، جس نے حدیث کے وقار کو بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو ''بہت حد تک گرادیا ہے۔'' اپنے ہم عصر علماء کے جبہ ودستار کے مضحکے اوران کے حواس خمسہ کی تعطیل وتحمیق سے بھی گریز نہیں کرتا۔'' جو بسا اوقات بڑے بڑے ائمہ وقت بلکہ صحابہ کے متعلق بھی ایسے الفاظ کہہ جاتا ہے جو بعض حالات میں ''بہتان'' قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اسی کو اور اس کے ساتھیوں کو اس بات کی چھوٹ دی جارہی ہے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں، نئی درسگاہوں اور جدید تحریکات کے علمبرداروں اوران کے پیروؤں کے اندر جو چاہیں پوری آزادی کے ساتھ پھیلاتے پھریں۔ کیا یہ مسلمان سواداعظم کے اجزاء نہیں ہیں اوران کو سواداعظم کے جسم سے کاٹ کر الگ کردینے میں کوئی گناہ نہیں ہے؟ کیا اس گروہ کے اندر اجتہاد کی ہوائے خودسری اگر بھر گئی تو اس سے "اعجاب کل ذی رای برأیه کا فتنہ اس امت میں نہیں برپا ہوجائے گا؟ کیا یہ بے چارے تصوف واحسان کی برکتوں اور اکابر امت کے ساتھ عقیدت مندیوں کے محتاج نہیں کہ ان کو ایسے بے دینوں کے حوالے کیا جارہا ہے جو ان کو نہ صرف علماء امت ہی سے بلکہ صحابہؓ تک سے بدگمان کرکے رکھ دیں گے؟ کیا یہ گروہ اقترابات کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہے کہ اس کو صرف ''ارتفاقات'' ہی پر ٹالا جارہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی اس اسلام کے محتاج ہیں جو اصلی اور صحیح اسلام ہے، ورنہ ایک مرتبہ اگر یہ غلط اسلام کے راستے پر ڈال دیے گئے اوران کو کسی غلط قسم کے آدمی یا غلط قسم کی جماعت کے تحت منظّم ہوجانے کا موقع دے دیا گیا تو یہ بھی اسی طرح اس امت کے لیے فتنہ بن سکتے ہیں جس طرح کوئی اور گمراہ فرقہ بن سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ علماء ایک طرف تو مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے اندر اتنے بے شمار خطرے گناتے ہیں لیکن دوسری طرف اس امت کا سارا ذہین طبقہ انہی کو الاٹ کیے دے رہے ہیں کہ ان کو وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ ایک طرف احتیاط بلکہ تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ ہماری چھوت تک سے مسلمان پلید ہوجاتا

ہےاور دوسری طرف یہ فیاضی ہے کہ سارا ذہین طبقہ ہماری ہی چراگاہ بنا کے چھوڑ دیا گیا ہے۔

غور کیجئے کہ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی مسلمانوں کے معاملات پر اسلام کے نفع ونقصان کو سامنے رکھ کے غور نہیں کرتے، یہ محسوس کررہے ہیں کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی دعوت سے ان کے عقیدت کیشوں کی عقیدت مندیاں متزلزل ہورہی ہیں اوران کے دھڑے کے آدمی ٹوٹ رہے ہیں، ان وجہ سے اس دعوت کے اندران کو بہت سے کیڑے نظر آتے ہیں اور یہ ان کو کرید کرید کے اپنے عقیدت مندوں کے سامنے رکھ رہے ہیں کہ کہیں بے خبری میں ان میں سے کوئی اس غذا کو نہ چکھ لے۔ باقی رہے دوسرے مسلمان جن کی نسبت ان حضرات کو یہ یقین ہے کہ اب وہ نئی تعلیم کی بدولت ذہنی طور سے اس قدر متغیر ہوچکے ہیں کہ ان کی طرف کبھی بھی رخ نہیں کرنے کے، ان کے خیر وشر سے ان کو کوئی بحث نہیں رہی ہے۔ ان کو جس کا جی چاہے جس راہ پر لگائے۔ جب وہ ان کے نہیں بنتے تو ان کو کالا چور لے جائے، ان کی پیزار سے۔ یہاں تک کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی (جس کے کام کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لیے، ان حضرات کے نزدیک اتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں) اگر وہ ان کو اپنے گرد جمع کرلے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ بھی اسلام ہی کی خدمت ہوگی۔

اگر ان حضرات کے سوچنے کا انداز اسلامی ہوتا اور فی الواقع مودودیؒ صاحب اور جماعت اسلامی کے کام کے اندر یہ حضرات وہی خطرے محسوس کرتے ہوتے جن کا صاحب تحریر نے اتنے سنجیدہ لب ولہجہ میں ذکر فرمایا ہے تو یقیناً یہ نہ صرف اپنے مریدوں کو، بلکہ تمام مسلمانوں کو، بلکہ تمام انسانوں کو اس فتنے سے بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر ان حضرات کے پیش نظر صرف یہ چیز ہے کہ اس دھارے کا رخ اپنی جاگیر کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دیں اور اپنی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے نہایت ثقاہت کے انداز میں مسلمانوں کو یہ بتادیں کہ ہے تو یہ دھارا بہت خطرناک لیکن اگر اس کا رخ فلاں سمت کی طرف مڑ جائے تو اس کے کچھ پہلو فوائد کے بھی ہیں، یہ ہمارے ان بزرگوں کا تورع ہے۔

اسلام کے متعلق ان حضرات کا جو تصور ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جس شخص کو یہ ایک مفسر اور فقیہہ کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اسی شخص کو ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے یہ سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ ''اقترابات'' کی میزان میں جو شخص ان کے نزدیک پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے، اسی شخص کو یہ ''ارتفاقات'' کی میزان میں پورا من بھر قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ا''ارتفاقات'' (اجتماعیات) کو اقترابات (وسائل قرب الٰہی) سے الگ کر کے دیکھنے کا یہ انداز ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سے نہیں سیکھا گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں تو کسی شخص کا ارتفاقات میں بھی درجہ متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اقترابات میں اس کا درجہ کیا ہے۔ اگر اقترابات میں اس کا پلہ ذرا بھی ہلکا نظر آتا تھا تو اسی کے بقدر اس کا پلہ ارتفاقات میں بھی ہلکا قرار دے دیا جاتا تھا، اس لیے کہ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے کہ دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے اور نہ قیصر اور خدا کے الگ الگ دائرے ہیں۔ یہاں جس طرح انفرادی زندگی خدا اور شریعت کے تحت ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی خدا اور رسول کے احکام کے تحت ہے۔ اس لیے جس طرح خانقاہوں اور درسگاہوں کا نظام ان لوگوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا جو خداناشناس ہوں، اسی طرح حکومت کا انتظام بھی ان لوگوں کے سپرد نہیں کیا جاسکتا جو خدا اور اس کی شریعت کو اچھی طرح جاننے والے اور صدق دل سے اس کو ماننے والے نہ ہوں۔ لیکن ہمارے ان بزرگوں کا دین چونکہ عیسائیوں کے دین کی طرح اجتماعیات سے بے تعلق ہے اس وجہ سے یہ اس بات پر راضی ہیں کہ مودودیؒ صاحب ان کے اجتماعی و سیاسی لیڈر بننا چاہیں تو شوق سے بن جائیں اگرچہ دینی و شرعی نقطۂ نظر سے وہ قطعی گردن زدنی ہیں۔ ہمارے ان بزرگوں کے اسی راہبانہ نقطۂ نظر کا یہ فیض ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی سو فیصد ایسے لیڈروں کے قبضے میں چلی گئی جو نہ صرف خدا کی شریعت سے منحرف ہیں بلکہ خدا کے بندوں کو اس کی شریعت سے منحرف کرنے والے بھی ہیں اور انھوں نے سیاسی طاقت حاصل کرنے کے

بعد مسلمانوں کی پوری زندگی کو جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صاحب تحریر بزرگ بھی اسی عام نظریہ کے مطابق مودودی صاحب کے لیے یہ حق تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں پر مسلط ہو جائیں اور بے خدا سیاست شوق سے چلائیں۔ لیکن یہ بات ان کو کھلتی ہے کہ وہ مذہبی اصولوں پر ایک جماعت بنائیں اور اس کے امیر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ساری انفرادی اجتماعی اور سیاسی زندگی کو مسلمان بنانے کی جدوجہد جاری کریں۔ اس میں بے شمار خطرے نظر آتے ہیں۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے جس فن ارتفاقات (اجتماعیات) میں مودودی صاحب کو از راہ عنایت ایک اونچا مقام عنایت فرمایا ہے اس کے اصول وفروع قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں یا مغربی فلاسفۂ سیاست سے؟ اگر قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں تو یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص کے بارے میں ایک طرف تو یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن وحدیث میں اتنا درک رکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں یہ بتانے کا اہل ہے کہ اسلام ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے لیے کیا اصول اور کیا ضابطے دیتا ہے اور اپنی اجتماعی اور قومی حیثیت میں وہ کس طرح اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ سکتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف اسی شخص کو اتنا نااہل سمجھا جائے کہ وہ لوگوں کو یہ بھی نہیں بتا سکتا ہے کہ ان کے مختلف حالات زندگی کے لیے شریعت کے احکام کیا ہیں اور وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں کس طرح اپنے رب کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا؟

اور اگر مودودیؒ صاحب کے یہ ارتفاقات مغربی جاہلیت ہی سے ماخوذ ہیں تو پھر صاحب تحریر بزرگ سے بادب گزارش ہے کہ آخر کس بنا پر وہ ایک ایسے شخص کی سیاسی قیادت تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں جو اپنے سیاسی واجتماعی نظریات میں مغربی فلاسفہ کا مرید ہے؟ کیا ہمارا دین اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہم کو نہایت تفصیلی ہدایات نہیں دیتا؟ اور کیا وہ ہدایات واجب التعمیل نہیں ہیں جو ہماری انفرادی زندگیوں سے متعلق ہیں؟

بہر حال جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو تھوڑا بہت کریڈٹ جو یہ حضرات دیتے بھی ہیں تو اس میں بھی ہمارے لیے کوئی پہلو تسلی کا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بھی ان حضرات کی ژولیدہ فکری اور ایک بڑی حد تک ان کے احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔

ان تمہیدی معروضات کے بعد اب آپ ان الزامات پر ایک ایک کر کے غور فرمائیے جو پوری متقیانہ شان احتیاط کے ساتھ اور توبہ واستغفار پڑھتے ہوئے ہم پر لگائے گئے ہیں:

(۱) سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ''جماعت اسلامی ایک فرقہ بنتی جا رہی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جماعت کے حلقے میں یہ زعم پیدا ہو رہا ہے کہ دین، دین کا فہم، دین کا درد، دین کا شعور بس اسی جماعت میں محدود اور اسی دائرے میں مخصوص ہے۔''

اس الزام کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو صاحب تحریر بزرگ کو یہ ہی پتہ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ بنتا ہے تو کس طرح بنتا ہے۔ محض اتنی سی بات سے کہ کچھ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ دین کا علم بس ہمارے ہی پاس ہے اور ہم ہی اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، وہ ایک فرقہ نہیں بن جاتے۔ اس کو ایک سخت قسم کی برخود غلطی کہہ لیجئے، غرور بے جا کہہ لیجئے، حماقت کہہ لیجئے مگر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا ہے۔ اگر اس طرح سے فرقے بن جایا کریں تو پاکستان اور ہندستان کے جتنے علماء اور مشائخ اپنے اپنے الگ الگ دائرے بنا کر کام کر رہے ہیں سب کو الگ الگ فرقے کا بانی قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا جو یہ نہ سمجھ رہا ہو کہ جو کام وہ کر رہا ہے کوئی دوسرا نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر ان میں کوئی اپنی نیک مزاجی کی وجہ سے دوسروں کو بھی کچھ وزن دے رہا ہے تو کم از کم اس کے معتقدین اور مریدین تو ہر گز اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کے ''حضرت'' کے سوا کسی اور کو بھی دین کا فہم اور شریعت کا کچھ علم حاصل ہے۔ پھر کیا یہ سب کے سب الگ الگ فرقے ہیں؟ خود صاحب تحریر بزرگ نے بھی اپنے اسی مراسلے میں جگہ جگہ بڑی دُون کی لی ہے۔ خصوصاً تصوف پر بحث کرتے ہوئے تو ان پر ''انا ولا غیری'' کا اتنا نشہ چڑھ گیا ہے کہ شیخ ابن عربی کا سکر

بھی ان کے سکر کے آگے صحو بن کے رہ گیا ہے۔لیکن محض اتنی سی بات کی وجہ سے ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ موصوف بھی کسی خاص فرقے کے بانی بن گئے ہیں بلکہ اس کو محض ان کی تنگ ظرفی پر محمول کرتے ہیں جو ایک بیماری ہے اور بہتوں کو لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

فرقہ بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوئی جماعت یا تو عقائد میں کوئی ایسی بات ایجاد کر بیٹھے جو کتاب وسنت کے بتائے ہوئے اور سواد اعظم کے اختیار کیے ہوئے عقائد سے مختلف ہو، یا دین کے جو معروف اور مسلّم ماخذ ہیں ان کے سوا اپنے لیے کوئی اور بھی ماخذ قرار دے لے۔ الحمد اللہ صاحب تحریر بزرگ نے بعض دوسرے بزرگوں کی طرح اس قسم کا کوئی الزام جماعت پر نہیں لگایا ہے۔ اس لیے ہماری یہ باادب گزارش ہے کہ جب تک وہ جماعت پر کسی نئے عقیدے یا نئے ماخذ دین کی ایجاد کا الزام نہیں لگا لیتے اس وقت تک جماعت پر ایک فرقہ ہونے کا الزام لگانے میں بھی وہ توقف فرمائیں۔

ایک فرقہ ہونے کا الزام تو درکنار جماعت اسلامی پر ایک الگ فقہی مذہب ہونے کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک الگ فقہی مذہب ہونے کے لیے بھی کم از کم پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ جماعت یا اس کے امیر نے اجتہاد کے کچھ اصول ایجاد کیے ہوں جو مذاہب اربعہ کے اصول اجتہاد سے مختلف ہوں۔ لیکن معلوم ہے کہ ہم نے اس طرح کی کوئی چیز ایجاد نہیں کی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے ہم پر نااہلیت اور غلط فتوے اور غلط اجتہاد کرنے کے الزامات لگائے ہیں، لیکن یہ الزام کہیں نہیں لگایا ہے کہ ہم نے ائمۂ اربعہ کے اصولوں سے کچھ الگ اصول، اجتہاد کے ایجاد کر لیے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو ایک الگ فرقہ قرار دینا تو درکنار وہ ایک الگ فقہی مذہب بھی قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔

رہی یہ بات کہ جماعت کے لوگوں کو یہ زعم ہے کہ ''صحابہؓ کے بعد دین کو بہمہ شعبہ جات کافّہ بس ہم نے سمجھا ہے۔'' یا یہ کہ ''ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں دوسرے نسلی اور تقلیدی''۔ تو یہ بات بالکل بہتان ہے۔ جماعت اسلامی اس قسم کی غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ

جماعت سے بدگمانی رکھنے والے حضرات پہلے خود اپنے دل میں یہ فرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہوگی، پھر خود ہی اپنے اس مفروضہ کو واقعہ کی شکل دے لیتے ہیں اور یہ کہنا شروع کردیتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہے۔ جماعت اسلامی جو کچھ سمجھتی ہے وہ تو بس اتنا ہے کہ آج پوری دین کو زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں قائم کرنے کی عملاً جدوجہد کرنے والی اور اس مقصد کے لیے آگے بڑھ کر لڑنے والی جماعت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی جو کہی جاتی ہے تو بطور فخر وغرور کے نہیں کہی جاتی، کیونکہ یہ بات کوئی فخر ی بات بہر حال نہیں ہے، بلکہ اظہار حسرت وافسوس کے کہی جاتی ہے کہ دین کی غربت اور حق کی بے کسی کا یہ عالم ہے کہ آج اس سرزمین پر باطل سے باطل مقاصد کے لیے بڑی بڑی پارٹیاں اور جماعتیں موجو ہیں، لیکن اسلام ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کو زندگی کے ہر شعبہ میں غالب کرنے کا حوصلہ رکھنے والی ایک چھوٹی سی جماعت، جماعت اسلامی کے سوا کوئی اور پارٹی موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ احساس محض ایک احساس نہیں ہے، بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ہمارے یہ بزرگان دین چونکہ اس بات میں اپنی تحقیر محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح بالواسطہ خود ان کی دینی خدمات کا انکار کیا جارہا ہے، اس وجہ سے وہ اس کو اس شکل میں تعبیر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اپنے سوا کسی کو دین کا فہم و شعور رکھنے والا سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔

جماعت کے طریق تنظیم کو بھی محض سطحی نظر سے دیکھ کر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ وہ ایک نیا فرقہ بن رہی ہے اور سوادِ اعظم سے کٹ رہی ہے، کیونکہ ہر مسلمان کو اپنے دائرے میں نہیں لے لیتی اور مسلمان کے اندر نسلی اور اصلی کا فرق کرتی ہے اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز کرتی ہے، لیکن دراصل یہ ساری باتیں ہمارے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں۔

جماعت اسلامی نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ اس کے اندر صرف وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو اسلام کو اپنی انفرادی زندگی کا بھی دین مانتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور

سیاسی زندگی کا بھی۔ نیز وہ اپنی انفرادی زندگی کی حد تک اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اس کو جاری کرنے کے لیے جد جہد کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ مجرد اس بنا پر کہ ایک شخص مسلمان گھرانے کے اندر پیدا ہوا ہے، بلالحاظ اس کے کہ وہ اسلام کے ساتھ کوئی عملی و اعتقادی وابستگی رکھتا ہے یا نہیں رکھتا ہے کوئی شخص اس جماعت میں داخل نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ آج مسلمانوں کی قوم ہر قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو اسلام کے ساتھ اس کے سوا کوئی نسبت نہیں رکھتے کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں، نہ وہ اسلام کے کسی حکم پر عمل ہی کرتے ہیں نہ اس کی کسی نہی سے بچتے ہی ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کو صرف انفرادی زندگی ہی کا دین مانتے ہیں، اپنی اجتماعی زندگی کو شریعت کی پابندیوں سے وہ بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کے اصولوں کے کھلم کھلا منکر ہیں، بلکہ اسلام کا مضحکہ اڑانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اب اگر کوئی جماعت اس عزم کے ساتھ اٹھے گی کہ وہ مسلمانوں کے اندر پورے دین کو قائم کرے گی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں اس طرح کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی کہ مذکورہ بالا تمام قسم کے مسلمانوں کی ایک فوج بھرتی کرلے۔ لامحالہ اسے یہی کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے ان مسلمانوں کو چھانٹے جو اعتقاداً بھی مسلمان ہوں اور عملاً بھی۔ اور جو اسلام کو انفرادی زندگی کا دین بھی مانتے ہوں اور اجتماعی زندگی کا دین بھی۔ پھر وہ انہی کو دوسرے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنائے۔ یہی کام جماعت اسلامی نے کیا ہے، لیکن اس پر ہمارے یہ بزرگان دین برہم ہیں کہ جماعت اسلامی اصلی مسلمان صرف اپنے ارکان ہی کو سمجھتی ہے، باقی سارے مسلمانوں کو صرف نسلی مسلمان قرار دیتی ہے اور جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں امتیاز کرتی ہے۔

جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں جماعت اسلامی امتیاز تو بے شک کرتی ہے، لیکن انتہائی نادان ہوگا وہ شخص جو یہ سمجھے کہ یہ امتیاز کفر و اسلام کا ہے یا صالح اور غیر صالح کا ہے۔ یہ امتیاز دراصل صرف اس پہلو سے ہے کہ جماعت کے اندر وہ لوگ ہیں جو اصلاح

کے کام میں ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں اوراس مقصد کے لیے وہ خالص اسلامی اصولوں پر ایک جماعتی نظام میں منسلک ہوگئے ہیں، جس کی بنا پر کوئی ان کو حکم دے سکتا ہے اور وہ اس کا حکم مان سکتے ہیں۔ باقی رہے جماعت سے باہر کے مسلمان تو وہ ہر قسم کے مسلمانوں پر مشتمل ہیں۔ان میں اسلام سے بالکل بے خبر بھی ہیں اوراسلام سے باخبر بھی۔ان میں صالح بھی ہیں اور فاسق بھی، ان میں اسلام کے دشمن بھی ہیں اوراسلام کے دوست بھی، ان میں اسلامی نظام کے چاہنے والے بھی ہیں اوراسلامی نظام کے مخالفین بھی، ہم ان کے اندر کے تمام صالحین اوراخیار کو اپنی ہی جماعت کا آدمی سمجھتے ہیں۔اگر چہ وہ ابھی ہم سے ملے نہیں ہیں۔لیکن ہم ان ''وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ'' کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ دیر یا سویر ہم ان سے مل جائیں گے یا وہ ہم سے مل کر رہیں گے۔ مقصد اور طریق کار کی یکسانی کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اور وہ زیادہ دنوں تک الگ الگ سفر کرتے رہیں۔اس وقت ہمارے اوران کے درمیان جو علاحدگی ہے وہ بیشتر نتیجہ ہے ان کی طرف سے بعض بدگمانیوں اور ہماری جانب سے بعض کوتاہیوں کا۔ہم نے اب یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم اپنی کوتاہیاں دور کر کے رہیں گے، خواہ وہ اپنی بدگمانیاں دور کریں یا نہ کریں۔ گو توقع ان کی طرف سے بھی ہم کو اچھی ہی ہے۔

(۲) دوسرا الزام جو صاحب تحری بزرگ نے جماعت پر لگایا ہے وہ جہل مرکب کا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ''جماعت کا ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہل علم سے رجوع کرتا ہے اور جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو۔اس لیے ان کے بڑے بڑے مدعیان علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں۔ کتاب وسنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر ان کی نظر بہت کم ہے۔''

میں صاحب تحریر بزرگ اوران کی طرح کے جماعت سے بے خبر اشخاص کی اطلاع کے لیے اس امر واقعی کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ جماعت کے اندر ہر شخص کا اپنے آپ کو

اجتہاد کا مستحق سمجھنا اور اجتہاد کرنا تو الگ رہا، جماعت کا ہر شخص اپنے آپ کو تقریر کرنے کا بھی نہ مستحق سمجھتا ہے اور نہ بلا اجازت تقریر کرتا ہی ہے۔ صرف وہی لوگ تقریر کر سکتے ہیں جو اپنی اہلیت کی بنا پر جماعت کے اہل حل وعقد کی طرف سے اس کے لیے مجاز قرار دیے گئے ہوں۔ جو جماعت اپنے ڈسپلن میں اتنی سخت ہو کہ ہر شخص کو تقریر کرنے کی بھی اجازت دینے کی روادار نہ ہو وہ ہر شخص کو اجتہاد کر ڈالنے کی چھوٹ کیسے دے سکتی ہے، درانحالیکہ ایک نااہل کا اجتہاد ایک نااہل کی تقریر سے اس کے لیے اور دوسروں کے لیے کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہے۔ اگر اس قسم کے کچھ برخود غلط ارکان جماعت کہیں موجود ہوں تو صاحب تحریر بزرگ اور ان کے ہم خیالوں سے ہماری گزارش ہے کہ ان کے ناموں اور ان کے اجتہادات کے کچھ نمونوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم جماعت کو ان کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ کر سکیں۔

رہے جماعت کے اہل علم تو ان کی نسبت جس رائے عالی کا اظہار کیا گیا ہے وہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں سے اکثر ہماری نسبت ظاہر کی جاتی رہی ہے اور ہم نے اس کا جواب دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کہ فی الواقع اس کا ہمارے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ آخر جو لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ تم عالم فاضل نہیں ہو تو ہم ان کے جواب میں کیا یہ کہیں کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو، ہم تو بڑے عالم فاضل ہیں اور ہمارے پاس یہ یہ سندیں اور یہ یہ تصدیقیں ہمارے علم و فضل اور تبحّر کی شہادت میں موجود ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تُو تُو مَیں مَیں کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لیے ہم اپنے ان بزرگوں کی ان لن ترانیوں کے جواب میں ہمیشہ خاموش ہی رہے۔ ہم نے خیال کیا کہ زمانہ خود بہترین جج ہے۔ وہ خود اس بات کا فیصلہ کر لے گا کہ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو میدان میں اس لیے اتار دیا ہے کہ وہ زمانے بھر سے لڑیں گے اور باطل پر حق کو غالب کر کے رہیں گے یا اس کشمکش میں اپنے آپ کو مٹا دیں گے ان کی قابلیتوں کی شہادت، اگر فی الواقع ان کے اندر کوئی قابلیت موجود ہے۔ خود زمانہ دے گا۔ ان کے لیے مدرسوں اور خانقاہوں کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس معاملہ کو خدا کے حوالے

کر کے کہ وہی تمام علم وفضل کا منبع ہے، چپ ہی رہے اور اب بھی جہاں تک اس جھگڑے کا تعلق ہے، ہم چپ ہی رہتے۔ لیکن صاحب تحریر بزرگ نہ ہماری بہت سی ''فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں'' کا اجمالی طور پر حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے۔ بتایا نہیں ہے کہ وہ غلطیاں کیا ہیں۔ یقیناً یہ غلطیاں بہتوں کے لیے ٹھوکر اور گمراہی کا سبب ہوسکتی ہیں، اس لیے ہم صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر سکیں۔ اور اگر موصوف کو ہم سے کسی اصلاح کی توقع نہ ہو تو پبلک ہی کو ان غلطیوں کی تفصیل سے آگاہ فرمادیں تاکہ لوگ ان سے محفوظ رہ سکیں۔

ایک اور بات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت ہوجائے تو اچھا ہے کہ ''تفصیلی مسائل'' سے ہمارے ان بزرگوں کی کیا مراد ہے جس کے علم و تفقہ میں جماعت کا ایک صاحب علم بھی لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا اس سے مراد اس طرح کے مسائل ہیں کہ کسی کنوئیں میں چوہیا مر جائے تو وہ کتنے ڈول پانی نکالنے سے پاک ہوگا؟ اگر یہی مراد ہے تو میں صاحب تحریر بزرگ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اس ''تفقہ'' میں آپ حضرات سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔ اگر اس سے مراد وہ مسائل ہیں جو موجودہ زمانے کی روزمرہ زندگی میں نئی تہذیب کے تصادم سے پیش آرہے ہیں تو اس طرح کے مسائل سے تعرض کرنے والی اگر کوئی جماعت آج موجود ہے تو یہی جماعت اسلامی ہی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ وہ اس کی اہل ہے یا نہیں۔ مگر چونکہ کوئی اور اہل تر جماعت آج میدان میں اس کام کے لیے آگے نہیں آرہی ہے۔ اس لیے تمدنی، اجتماعی اور سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی نے اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہے جو ان مسائل میں اپنے علم و تفقہ کو جماعت اسلامی کے علم و تفقہ سے زیادہ لائق اعتماد سمجھتی ہے تو بسم اللہ وہ آگے بڑھے جماعت اسلامی اس کے پیچھے چلے گی۔ نااہلوں کو تو آگے بڑھنے کا موقع دیا ہی اس چیز نے ہے کہ جو اہل تر تھے انھوں نے اپنی ذمہ داریاں محسوس نہیں کیں۔

مولانا مودودیؒ کا علم و مطالعہ بھی مدرسی و خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کا غرور علم اکثر اعتراف حق پر غالب آیا ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے لیکن میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم وافکار پر نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں اور ایک بلند پایہ انشاپرداز ہیں، بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت پر بہت گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں۔ صرف بیضاوی اور جلالین ''بقدر نصاب'' پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں۔ انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف بہ حرف نہایت غور وفکر کے ساتھ پڑھا ہے۔ صرف ان کے ''دورہ'' پر اکتفاء نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ بھی محققانہ ہے۔ میں ۲۰ ماہ ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں اور میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں اور کس قدر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے صرف جیل کے قیام کے دوران میں علوم وفنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعۂ کتاب و سنت پر بانداز استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں ان کو شاید مدۃ العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت نہیں حاصل ہوئی ہوگی۔ میں نے جب کبھی ان کی کوئی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت کے لیے اٹھائی تو حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر بھی دیکھا ہے کہ ان کے اہم یا قابل تنقید مقامات پر حاشیہ میں خود ان کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیوں کی طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے، جیل کے دوران قیام مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل یا غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے

اور میں نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات سمجھنے میں مدرسی مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ پھر کام کو وہ جس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے جب تک اس کے لیے اچھی تیاری نہ کرلیں۔ اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب وسنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کرسکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب وسنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کسی شخص پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

(۳) صاحب تحریر بزرگ نے سب سے زیادہ درد انگیز الفاظ میں جو الزام ہم پر لگایا ہے وہ تصوف کے انکار اور اکابر تصوف کی تحقیر کا ہے۔ اس الزام کے پہلے حصے کے متعلق تو یہ گزارش ہے کہ ہم نے تصوف کی مخالفت جس پہلو سے اور جس وجوہ سے کی ہے انھیں مولانا مودودی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے اور میں نے بھی اپنے رسالہ ''حقیقت تقویٰ'' میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ جو شخص چاہے ان رسائل کی مدد سے ہماری مخالفت کی حقیقت اور اس کے اسباب و وجوہ معلوم کرسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکابر تصوف کی کسی نوعیت سے کوئی تحقیر کی ہے۔ وہ تمام اکابر صوفیہ جنھوں نے دین کی خدمتیں انجام دی ہیں ہمارے نزدیک بھی اسی طرح محترم ہیں جس طرح صاحب تحریر بزرگ کے نزدیک وہ محترم ہیں۔ لیکن اس احترام کے لیے ہم یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کو بالکل معصوم بنا کے رکھ دیں اور ان کو وہ درجہ دے دیں جو ہمارے دین میں صرف اللہ کے رسول کو دیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کے احترام کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس پر کسی پہلو سے کوئی تنقید ہی نہ کی جائے تو ہم اس کو احترام نہیں سمجھتے، بلکہ بت پرستی سمجھتے ہیں اور اس بت پرستی کو مٹانا منجملہ ان مقاصد کے ایک اہم مقصد ہے جن کو جماعت اسلامی اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔ جو شخص ہمارے لٹریچر کو پڑھتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب، مجدد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے متنفر ہو، یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم اسی کام کو انجام دینا چاہتے ہیں جس کو ان

بزرگوں نے انجام دینا چاہا تھا اور اس کام میں ان بزرگوں کی رہنمائی سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن اس فائدہ اٹھانے میں ہم اس کسوٹی سے بھی کام لے رہے ہیں جو صحیح اور غلط کے پرکھنے کی واحد کسوٹی ہے اور جس پر جانچے بغیر کسی بڑے سے بڑے بزرگ دین کی بات کو مان لینا بھی ہمارے دین میں ایک صاحب علم کے لیے حرام ہے۔ اس کسوٹی کا نام کتاب وسنت، ہمارے صاحب تحریر بزرگ نے بھی یہ نام بار بار لیے ہیں لیکن معلوم نہیں وہ ان کے مصرف سے بھی واقف ہیں یا نہیں؟

تصوف کے متعلق جماعت اسلامی بحیثیت ایک جماعت کے تو کوئی مسلک نہیں رکھتی کیونکہ وہ اس طرح کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ اور مودودی صاحب کا نظریہ اس معاملہ میں بہت نرم ہے، جیسا کہ تجدید واحیاء دین اور رسالۂ دینیات سے معلوم ہوتا ہے مگر میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں مروجہ تصوف کو بدعت سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اس کو اس احسان سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جو شریعت میں مطلوب اور معتبر ہے۔ احسان کی کوئی اپنی خاص شکل وصورت شریعت سے الگ نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اس قدر ہے کہ آدمی اللہ کی شریعت پر پورے صدق دل اور پورے حضورِ قلب کے ساتھ اس کی روح اور حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کرے۔ دنیا میں انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ ہی ہے اور وہ اپنے اس اصلی مقصد کو کبھی نا تمام چھوڑ کے نہیں جاتے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے اصول وفروع مرتب کرنے پڑیں۔ اگر دوسرے لوگ ایسا کریں تو خلق اور خالق دونوں کے نزدیک ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی ہر بات کے متعلق ثبوت بہم پہنچائیں کہ انھوں نے یہ بات قرآن کی کس آیت سے یا پیغمبر کی کس حدیث سے اخذ کی ہے۔ اس معاملہ میں نہ کسی شخص کا مجرد ذوق معتبر ہے اور نہ کسی شخص کا کشف وحال قابل لحاظ ہے، اور یہ کہنا تو انتہائی درجہ کی ضلالت ہے کہ تزکیہ کے یہ رموز کسی خاص شخص یا چند خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو سکے، دوسروں پر پیغمبر ﷺ نے ان کو نہیں کھولا۔ یہ اسلام میں باطنیت کی بنیاد رکھنا ہے اور دین اسلام کی روح اس باطنیت کا قلع قمع کرنا

چاہتی ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ خدا کے رسول پر سب سے بڑی تہمت لگاتے ہیں اور ہزار ہا فتنوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مخالفت کی ہے اس کو صاحب تحریر بزرگ نے ''اعراض'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے صرف اعراض نہیں کیا ہے، بلکہ تصوف کی نہایت مدلل مخالفت کی ہے اور صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی ہے، بلکہ اس کی جگہ پر کتاب و سنت سے اس احسان کے اصول بھی مرتب کر دیے ہیں جو اسلام میں معتبر ہیں۔ پھر ان کی مخالفت کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہے کہ آدمی اس کو معلوم کرنے کے بعد بغیر اس کے بارے میں یکسو ہوئے چین کی نیند سو سکے۔ ہمارے اکابر تصوف اور ابن تیمیہ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا ایک سرسری اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات شیخ ابن عربی کو شیخ الکل سمجھتے ہیں اور تصوف میں سارا مدار سخن انھی پر رکھتے ہیں۔ لیکن ابن تیمیہؒ کے پاس ان کے لیے دجال سے کم کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ابن تیمیہ سارے تصوف کو بدعت و ضلالت قرار دیتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے تقریباً اپنی ساری ہی کتابوں اور سارے ہی رسائل میں کسی نہ کسی پہلو سے تصوف پر تنقید کی ہے لیکن خاص طور پر ایک شیخ تصوف کی ایک تصنیف کو انھوں نے تنقید کے لیے انتخاب کیا اور اس پر تنقیدی نوٹ لکھے جن کو بنیاد قرار دے کر ان کے شاگرد علامہ ابن قیم نے مدارج السالکین لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں صوفیہ کے تصوف پر ابن قیم نے پوری تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ تصوف قدم قدم پر کتاب و سنت سے منحرف ہے۔ میری نگاہ سے آج تک فن تنقید پر اس سے زیادہ عالمانہ اور اس سے زیادہ منصفانہ کتاب کوئی اور نہیں گزری۔ اس کتاب نے ایک طرف تو بدعی تصوف کے بخیے ادھیڑ ڈالے ہیں، دوسری طرف احسان کے تمام مقامات و مدارج کی کتاب و سنت کے نہایت واضح دلائل کے ساتھ تفصیل کر دی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ تصوف میں کیا کیا خرابیاں ہیں، کن پہلوؤں سے اس نے ہمارے تمام معیارات بدل ڈالے ہیں اور کسی طرح اس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ العیاذ

باللہ انبیاء اور صحابہ تقویٰ اور تزکیہ کے لحاظ سے معیاری لوگ نہیں تھے۔ ابن قیم نے تمام مقامات کی تشریح کر کے یہ دکھایا ہے کہ ان حضرات نے اپنا منتہی کتاب وسنت کے مقرر کیے ہوئے منتہا سے ہر میدان میں آگے مقرر کیا ہے جس کے سبب سے ایک طرف تو کتاب وسنت نگاہوں سے گرتی ہیں اور دوسری طرف امت میں رہبانیت کی بیماری پھیلتی ہے۔ کیونکہ ہر معاملہ میں صحیح فطری اور عملی حدود ہی ہوسکتی ہے جو شریعت نے مقرر کردی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے گا تو لازماً وہ فطرت سے جنگ کرے گا اور رہبانیت کے دروازے کھولے گا۔

جن لوگوں نے اتنی وضاحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کردیا ہے اور صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی راہ کھولی ہے ان کو ہمارے صاحب تحریر بزرگ صرف ''اعراض'' کرنے والا قرار دیتے ہیں[1]۔ میں صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مدارج السالکین پڑھیں۔ اس سے انھیں ایک حد تک اندازہ ہوسکے گا کہ تصوف کے متعلق جو رائے میں ظاہر کررہا ہوں وہ محض خیرہ سری اور بددماغی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ارباب تصوف کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف اور احسان دو مختلف چیزیں ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے بھی ایک سمجھا انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر کی نیتیں نیک ہوں۔

ان واجب الاحترام بزرگوں کی غلطیاں گنانا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے لیکن اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے ایک آدھ مثال کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں صاحب تحریر بزرگ ہی کی تحریر سے ایک مثال تصوف کی خوفناک بدعتوں کی پیش کرتا ہوں۔ ہمارے صاحب تحریر بزرگ ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] شاید یہ نرمی اس لیے ہے کہ ان بزرگوں کی وفات پر چند صدیاں گزرچکی ہیں اور غصہ کے اصل مستحق معاصرین ہوا کرتے ہیں

''نقشبندیہ اور خصوصاً مجدد سرہندیؒ نے تصور شیخ تک کو استعمال کرایا جو بے حد خطرناک اور مخدوش طریقہ ہے۔ محض اس لیے کہ جانتے تھے کہ لوگ عموماً خوگر پیکر محسوس ہیں۔ صورت محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں۔ محسوس پرستی کا ذوق اس قدر مسلط ہے اور تجرید وتفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا تصور وتمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی، صورت پسندی اور ''اِجعَل لَّنَآ اِلٰھا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً'' کی بدذوقی نے تنزیہی الوہیت، بے شبہہ وبے مثال، بے کیف دلوں، بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا اور وصول ہے ضروری، لہٰذا ہوائی سفر کے بجائے اگر چھکڑے ہی کے ذریعے قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصد تو وصول ہے۔''

اس عبارت کو پڑھ کر حضرت مجدد سرہندیؒ، حضرات نقشبندیہ اور صاحب تحریر بزرگ کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے چند باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس دلیل کی بنا پر کہ لوگ پیکر محسوس کے خوگر ہیں اور بغیر کسی پیکر محسوس کے ایک بے جہت و بے قیاس خدا کا تصور نہیں کر سکتے، ان کو تصور شیخ کا طریقہ استعمال کرایا جا سکتا ہے، تو آخر ہندوؤں کی بت پرستی اور مظاہر پرستی میں کیا قباحت ہے؟ ان کے فلسفی بھی تو یہی کہتے ہیں کہ لوگ ایک مجرد حقیقت کا تصور نہیں کر سکتے اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کو اس کا تصور محسوس مظاہر کی شکل میں کرایا جائے، مقصود تو حقیقت مجرد تک پہنچنا ہے۔ لہٰذا ہوائی جہاز کے ذریعہ اگر سفر نہیں ہو سکتا تو چھکڑے ہی کے ذریعے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے! ہندستان کے ہندو ہی نہیں بلکہ عرب کے بت پرست بھی بتوں کی پوجا پاٹ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ ان کو خداوند عالم سمجھتے تھے بلکہ ان کو وہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کی بت پرستی تو شرک قرار پائے اور آپ کا تصور شیخ توحید؟۔ یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے بہت سے لوگ تصوف کو برہمنوں کے یوگ سے ماخوذ بتاتے ہیں اور ہمارے صاحب تحریر بزرگ کی مذکورہ بالا تقریر سے ان کے خیال کو پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کی فطرت، اس فطرت کے تقاضوں، اس کی بیماریوں اوراس کے علاج کو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر طریقہ پر جانتے ہیں یا مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ؟ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر طریقہ سے جانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ نے اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار فرمایا وہ صریحاً اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے اختیار کیے ہوئے طریقہ سے مختلف ہے؟ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا:

اِجۡعَلۡ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمۡ اٰلِهَةٌ. (الاعراف: ۱۳۸)

(ہمارے لیے بھی اس قسم کا معبود بنادے جس قسم کے معبودان بت پرست قوموں کے پاس ہیں۔)

تو یقیناً یہ مطالبہ اسی وجہ سے کیا تھا کہ وہ صورت محسوس کے بغیر مجرد معنیٰ تک وصول کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے بجائے اس کے کہ ایک بت گھڑ کے ان کے سامنے رکھ دیتے یا ان کو تصور شیخ کا نسخہ استعمال کرادیتے۔ فرمایا:

اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَبۡغِيۡكُمۡ اِلٰهًا. (الاعراف: ۱۴۰)

(کیا میں خدا کے سوا تمہارے واسطے کوئی اور معبود لاؤں۔)

انھوں نے اس کا ذرا لحاظ نہ کیا کہ یہ بے چارے خوگر پیکر محسوس ہیں اور ابھی ابھی مصر کے بت پرستانہ ماحول سے نکلے ہیں۔ اس لیے ایک بے شبہ و بے مثال خدا کا تصور نہیں کرسکتے ... مستحق ہیں کہ ان کو ایک بچھڑا بنا کر دے دیا جائے، مقصود تو پہنچنا ہے، خدا تک نہ پہنچے بچھڑے ہی ... سہی۔

نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو کوئی بت بنا کر نہیں دیا، بلکہ ان کی عدم موجودگی میں جب ... سرائیل نے ازخود ایک بچھڑا بنالیا تو انھوں نے طور سے واپسی پر اس کو بھی ریزہ ریزہ کر کے ... ر میں پھنکوادیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس بت کے بنانے میں شریک رہے تھے انہی کے بھائی

بندوں کے ہاتھوں قتل کرادیا اور ذرا اس بات کا خیال نہ کیا کہ یہ بے چارے خوگر پیکر محسوس تھے، ان کو ہوائی جہاز میسر نہیں آیا تھا اس لیے بچھڑے ہی پر سوار ہو لیے تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے جب یہ کہا کہ:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً. (البقرہ: ۵۵)

(ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔)

تو اس وقت بھی انھوں نے اپنی اسی کمزوری کا اظہار کیا تھا جس کمزوری کے مداوا کے لیے حضرات نقشبندیہ نے تصور شیخ کا نسخہ تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کمزوری کا لحاظ فرمانے کے بجائے پہلے تو ان کو ڈانٹا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، تمہاری رسائی میری صفات کے مشاہدہ سے آگے نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی جب وہ اپنی ضد پر مصر ہی رہے تو بجائے اس کے کہ ان کی کمزوری پر رحم کر کے ان کو تصور شیخ کا نسخہ استعمال کر دیا جاتا ان کو خدا کی طرف سے ایک کڑک نے آ دبوچا۔

پیکر محسوس کے خوگروں کے لیے خدا اور اس کے نبی کا اختیار کیا ہوا طریقہ اور علاج تو یہ ہے جو بیان ہوا۔ لیکن مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ کا طریقہ علاج، صاحب تحریر بزرگ کے بقول، اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اس خیال سے کہ لوگ حقیقت مجرد کا تصور نہیں کر سکتے ان کو تصور شیخ کا رستہ دکھا دیا۔ اب بتائیے کہ ایک مسلمان جو خدا اور اس کے نبیوں پر ایمان رکھتا ہے ان میں سے کس کے طریقے کو اپنے لیے پسند کرے؟ اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کو یا مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ کے طریقے کو؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ صاحب تحریر بزرگ فرماتے ہیں کہ ''ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعے اگر قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی، مقصود تو وصول ہے۔'' اس میں شبہ نہیں کہ اگر موٹر میسر نہ آئے تو چھکڑے پر بھی سفر کیا جا سکتا ہے، بلکہ پیدل بھی چلا جا سکتا ہے۔

لیکن سوال ''وصول'' سے متعلق ہے کہ آپ پہنچنا کہاں چاہتے ہیں؟ خدا تک یا کہیں اور؟ اگر خدا تک پہنچنا پیش نظر ہے تو لامحالہ آپ کو وہاں تک پہنچنے کے لیے وہی طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو خدا نے اپنے تک پہنچنے کے لیے بتائے ہیں۔ اس طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہونچ سکتے۔ اگر تصور شیخ خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے اور کتاب وسنت سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے تو اس سے بحث نہیں کہ یہ چھکڑا ہے یا موٹر، آپ شوق سے اس پر سوار ہو جائیے۔ ہم آپ کو ہرگز نہیں روکتے۔ لیکن اگر یہ کوئی ذریعہ سرے سے ہے ہی نہیں، یا خدا تک پہنچانے کے بجائے خدا سے پھیرنے والا ذریعہ ہے تو اس کو اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہونچ سکیں گے، بلکہ ہلاکت کے کسی گڑھے میں جا گریں گے۔ ہاں اگر مقصود بس کہیں نہ کہیں پہونچ جانا ہے، کوئی منزل معین نہیں ہے تو ہمیں ایسے جادہ پیماؤں سے بحث نہیں ہے، وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔

بہر حال ہم جو تصوف کو بدعت کہتے ہیں وہ اربابِ تصوف کی اسی قسم کی کتاب وسنت سے ہٹی ہوئی باتوں ہی کی بنا پر کہتے ہیں۔

صاحب تحریر بزرگ نے تصوف کی حمایت میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی نقل کی ہے۔ لیکن امام غزالی کی شہادت ان لوگوں کو کیا مطمئن کر سکتی ہے جو ہر معاملہ میں کتاب و سنت کی دلیل ڈھونڈھتے ہوں۔ امام غزالی کے متعلق یہ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبوت کی حقیقت اور خاصیت صوفیوں کے طریقوں سے سمجھی ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ لیکن انھوں نے نبوت کی حقیقت کیا سمجھی ہے یہ سوال بجائے خود بڑا اہم ہے۔ امام غزالی کی تصنیفوں سے جو حضرات اچھی طرح واقف نہیں ہیں، محض ان کے نام ہی سے مرعوب ہیں، وہ ان کو جو چاہیں بنا کے رکھ دیں۔ لیکن جن لوگوں نے ان کی تصنیفات اچھی طرح پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ فلسفۂ یونان کے چکر سے آخر تک پوری طرح نہ نکل سکے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی جتنی تردید کی ہے، اس سے زیادہ فلسفۂ یونان کے غلط نظریات کو دین کی سند دی ہے۔ صاحب

تحریر بزرگ نے امام صاحب کے جن رسائل کا حوالہ دیا ہے وہ اگر پسند فرمائیں تو میں انہی رسائل سے متعدد باتیں ایسی نکال دے کر سکتا ہوں جو امام غزالی نے فلسفۂ یونان سے لی ہیں، قرآن اور حدیث سے ہرگز نہیں لی ہیں۔ سر سید مرحوم نے بیشتر امام غزالی ہی کی کتابوں پر اپنے متجددانہ نظریات کی بنیاد رکھی ہے اور ان نظریات ہی کی بنا پر مولوی حضرات نے ان کو برا بھلا کہا ہے۔ خود نبوت کے مسئلے پر مجھے امام صاحب کی رائے سے شدید اختلاف ہے اور میں ان کی رائے کو فلسفۂ یونان سے مرعوبیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے تو ان کے متعلق یہ ہے کہ:

دخل فی بطن الفلسفة فلم یخرج منها.

(وہ فلسفہ کے پیٹ میں گھسے اور پھر اس سے نکلنا ہی نصیب نہ ہوا۔)

اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مفید ترین کتاب ''احیاء العلوم'' ہے۔ بالخصوص محبت الٰہی وغیرہ موضوعات پر اس کی جو بحثیں ہیں وہ نہایت بیش قیمت ہیں، لیکن اس میں بھی صوفیانہ طرز فکر کی وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) چوتھا بڑا الزام مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پر یہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہ راست کتاب وسنت سے سمجھنے کے مدعی ہیں۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ دین کو کتاب وسنت ہی کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب، جیسا کہ صاحب تحریر بزرگ نے سمجھا ہے، ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمام فقہاء و محدثین اور ان کی تمام فقہی اور دینی خدمات سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی یا حال کے رجالِ دین کی چیزیں جب پڑھتے ہیں تو صرف انہی کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے، بلکہ اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں۔ اور ان کی ہر بات کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اس دلیل کا کیا وزن ہے؟ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ

کرنے ہی سے دنیا میں آباء پرستی کی بنیاد پڑی ہے اور خدا کے بندوں کا رشتہ خدا کی شریعت سے ٹوٹا ہے۔ اس بات کی تاکید ہمیں جس طرح قرآن وحدیث میں کی گئی ہے، اسی طرح اس کی تاکید خود ان بزرگ ائمۂ دین نے بھی کی ہے جن کی اندھی تقلید پر جینا اور مرنا آج نجات کے لیے ضروری خیال کیا جانے لگا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے واضح ہدایات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں۔ انہوں نے مختلف الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ جو شخص یہ نہ جانے کہ فلاں بات ہم نے کتاب وسنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ ہماری اس بات کی بنا پر فتوے نہ دے۔

باقی رہی یہ بات کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں تو اس کی نسبت بھی نہایت واضح الفاظ میں یہ ظاہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اپنی مادی زندگی کے باقی رکھنے کے لیے جتنا ضروری ہوا اور پانی کو سمجھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری اپنی روحانی زندگی کے لیے ہم اجتہاد کو سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ضرورتیں دوسروں کی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دوسروں کا دین ان کی زندگی کے ایک نہایت محدود حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے چند لگے بندھے ضابطے ہیں اور وہ اس محدود دائرے کے اندر، اگر ان کا جی چاہتا ہے، اس کی پیروی کر لیتے ہیں۔ زندگی کے باقی گوشوں میں ان کو اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کی پیروی کرتے ہیں، خدا کی یا شیطان کی۔ لیکن ہمارا دین ہماری زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ وہ ہماری انفرادی زندگی کا بھی دین ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس سے بالا رادہ انحراف کو کفر وفسق سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے جتنے معاملات بھی آئیں ہم ان پر غور کر کے یہ دیکھیں کہ ان کے بارے میں ہمارے دین کی رہنمائی کیا ہے۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب وسنت میں نہایت واضح احکام مل جاتے ہیں، چنانچہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب وسنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ائمۂ سلف نے اس کے بارے میں کیا اجتہادات فرمائے ہیں۔ ان کے اجتہادات میں سے جن کے قول کو کتاب

وسنت سے سب سے زیادہ لگتا ہوا پاتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر معاملہ ایسا ہے جو ائمہ کے زمانے میں پیش نہیں آیا ہے یا اس کے بارے میں ان کی رائیں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں تو ہم خود اس پر غور کرتے ہیں کہ کتاب وسنت سے لگتی ہوئی بات اس کے بارے میں کیا ہو سکتی ہے اور جس طرح ہماری تحقیق ہم کو لے جاتی ہے ہم اس کو عمل کے لیے اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری تحقیق غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی، لیکن ہم دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے اجر کے امیدوار ہیں اس لیے کہ ہماری ذمہ داری صرف اسی قدر ہے کہ جن امور کے سلسلہ میں خدا اور اس کے رسول کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو اور نہ ان کے بارے میں ہم سے بہتر لوگوں کے اجتہاد ہی نے ہماری کوئی رہنمائی کی ہو ان کے بارے میں ہم اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں اور جس بات پر ہمارا دل ٹھک جائے کہ یہ خدا کی شریعت سے اوفق ہے اس کو اختیار کر لیں۔ ہم خلوص نیت کے ساتھ جو بات اختیار کر لیں گے وہی بات ہمارے لیے موجب اجر بن جائے گی۔ خواہ وہ فی الحقیقت غلط ہو یا صحیح۔ ہم اس بات کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے کہ جس بات میں ہمیں خدا اور رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ ملے تو ہم شریعت سے اوفق کی جستجو کیے بغیر باطل ہی کی پیروی کر ڈالیں، یا اگر اہل تر حضرات مسجد میں نماز پڑھانے کے لیے آنا چھوڑ دیں تو ہم بھی نماز پڑھانے سے انکار کر دیں۔ ہم ایسی خاکساری کے قائل نہیں ہیں جو ادائے فرائض میں مانع ہو۔

اب صرف دو باتیں اس سلسلہ میں قابل غور رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ہم نے کوئی اجتہاد ایسا کیا ہے جو ائمہ اربعہ یا ان کے اکابر متبعین کے اجتہاد کے خلاف ہے اور ہم نے ان سب کو چھوڑ کر اپنی کوئی الگ راہ نکالی ہے؟ دوسری یہ کہ کیا ہم نے اپنے سے بہتر اہل علم کو نظر انداز کر کے خود مسند اجتہاد سنبھال لینے کی کوشش کی ہے؟ میں ان دونوں باتوں کو بھی یہاں صاف کر دینا چاہتا ہوں۔

اگرچہ اس بات کی کوئی دلیل حصر موجود نہیں ہے کہ فقہ کو ائمہ اربعہ ہی کے اندر دائر و سائر

رکھنا چاہیے اور اس دائرے سے الگ ہو کر دین میں کسی اجتہاد کے لیے گنجائش نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے جس قول کا صاحب تحریر بزرگ نے حوالہ دیا ہے وہ بھی محض ان کا ذوق ہے، اس کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل انھوں نے نہیں دی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو صاحب تحریر بزرگ نے شاہ صاحب کا بیان فرمایا ہے۔ وہ ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو بر بنائے دلائل ترجیح تو دیتے ہیں، لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے اجتہادات کو یک قلم نظر انداز کر کے کوئی اجتہاد کیا جائے۔ میں نے یہ بات متعدد بار ان کی تقریروں میں سنی ہے۔ اس وقت یہ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے یہ بات کہیں لکھی بھی ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ صاحب علم کے لیے کسی ایک فقہ کے تقید کو تو صحیح نہیں سمجھتے، لیکن مذاہب اربعہ کے تقید کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اصولاً ہر مذہب کے صرف ان متقدمین کو لائق اعتناء سمجھتے ہیں جو خود مجتہد تھے۔ ان متاخرین کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو اگلوں کے نرے مقلد تھے۔ مجھے ان کے کسی ایسے اجتہاد کا پتہ نہیں جس میں انھوں نے ائمہ اربعہ کو چھوڑ کر تفرد اختیار کیا ہو۔ اگر صاحب تحریر بزرگ ان کے کسی ایسے اجتہاد سے واقف ہوں تو اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

رہی دوسری بات کہ ہم نے اپنے سے بہتر اہل علم کو نظر انداز کیا ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو اس ملک میں ایسے اہل علم ہیں ہی کتنے جو اجتماعی اور سیاسی مسائل میں دین کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اگر کچھ لوگ ایسے ہیں بھی تو ابھی تو وہ ہم سے اسی بات پر لڑ رہے ہیں کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کوئی علاقہ ہے بھی یا نہیں؟ حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مغرب زدہ لیڈروں تک نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارا دین جس طرح ہماری انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح ہماری سیاسی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ابھی ہمارے بزرگان دین کے دل کی کھٹک پوری طرح نہیں نکلی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان اصل مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے اور اسی پر وہ ہم سے لڑ رہے ہیں کہ دین کو ان چیزوں سے کوئی تعلق

بھی ہے یا نہیں جن چیزوں سے ہم ان کا تعلق جوڑ رہے ہیں تو ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کر سکیں کہ ہمارے سامنے یہ یہ مشکلات ہیں، ان میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔ اس لیے مجبوراً ہمیں اپنا کام خود ہی سنبھالنا پڑا ہے۔ لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ جس دن ہم یہ محسوس کر لیں گے کہ ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہا ہے تو ہم سے زیادہ کسی کو اس بات میں خوشی نہیں ہوگی کہ ہم ان کی رہنمائی سے مستفید ہوں۔

بہر حال ہم نے اجتہاد کے کام کو کوئی فخر اور لذت کا کام کبھی نہیں سمجھا ہے اور نہ کبھی اس دائرے کے اندر ہم نے کوئی اجتہاد کیا ہے۔ جس دائرے کے اندر ہم سے بہتر لوگ اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ ہم نے اس کام کو ایک ناگزیر دینی ضرورت کی حیثیت سے انجام دیا ہے اور صرف اس حد تک اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جس حد تک شریعت کے ساتھ اپنی زندگی کا ربط قائم رکھنے کے لیے ہم اس کے محتاج تھے۔

(۵) ایک الزام صاحب تحریر بزرگ نے تنقید میں بے اعتدالی کا بھی لگایا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو تنقید کا چسکا پڑ گیا ہے اور وہ اس کام کو محض لذت نفس کے لیے کرتے ہیں اور چونکہ لذت نفس کے لیے کرتے ہیں اس لیے لازمی طور پر اس میں غیر معتدل بھی ہو گئے ہیں۔

یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ لذت نفس اور تسکین ذوق کے لیے اس زمانے میں مشاغل کی کمی نہیں ہے کہ ہم اس کے لیے یہ راہ ڈھونڈتے۔ ہمارا کوئی کام بھی محض ایک مشغلہ کے طور پر نہیں ہوتا اور نہ ہم کبھی مضمون نگاری محض مضمون نگاری کی خاطر کرتے ہیں۔ ہماری تمام تحریری اور تقریری سرگرمیوں کا محور وہ دعوت ہے جو ہم اقامت دین کے لیے دے رہے ہیں، جب تک کسی چیز کا اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ ہو وہ ہمارے یہاں زیر بحث نہیں آتی۔ اور تنقید کے لیے تو ہم کبھی اس وقت تک قلم اٹھاتے ہی نہیں جب تک کسی چیز کی نسبت ہم یہ نہ محسوس کر لیں کہ یہ دعوت دین کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہے۔ تصوف پر ہمارے ہاں جو کچھ بھی لکھا

گیا ہے اسی پہلو سے لکھا گیا ہے۔ ہم نے خود پیش قدمی کر کے کبھی اس سے تعرض کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہمارے سامنے بار بار یہ بات بڑے اصرار کے ساتھ لائی گئی کہ اصلاح وتزکیہ اور تجدید دین کا اصلی راستہ وہ ہے جو ارباب تصوف نے اختیار فرمایا۔ ہم نے ایمانداری کے ساتھ اس رائے کو غلط سمجھا اس لیے ہم نے اپنا یہ فرض جانا کہ جو کچھ ہمارے نزدیک صحیح ہے ہم اس کو بیان کردیں تا کہ ہمارا موقف لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اب اگر آپ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ ''یہ احوال وکوائف اور اسرار ومواجید ہیں جن پر تنقید کی ضرورت اور نہ رائے زنی کی حاجت'' یا ''عشاق کے یہ صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں'' نہ آنکاری کنم ونہ ایں کاری کنم'' کا معاملہ ان کے ساتھ مناسب ہے۔'' یا ''یہ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کے اسٹیج پر افشاء کے لیے نہیں ہوتے۔'' تو کس نے آپ حضرات سے یہ کہا تھا کہ یہ خلوت کے اسرار جلوت کے اسٹیج پر بیان فرمایئے یا عشاق کے ان صحیفوں کی منظر عام پر نمائش کیجئے؟ یقیناً اس پردہ دری کے مجرم ہم نہیں ہیں بلکہ آپ ہی حضرات ہیں۔ جب آپ ان کو منظر عام پر لا چکے تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو جوہر شناس ہیں، اس لیے کہ ان کے اندر اسرار بند ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے کے معنی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کہ جن کی توجہ اس کی طرف نہ بھی ہونے والی ہو وہ بھی اس نقاب کو الٹنے کے مشتاق اور آرزومند ہو جائیں۔

جب آپ ایک کتاب لکھتے ہیں اور پریس اس کو چھاپ بھی دیتا ہے تو اس کو اہل اور نااہل سبھی پڑھیں گے۔ آپ کے اس کہہ دینے کی وجہ سے کہ نااہل اس کو نہ پڑھیں یہ نہیں ہوگا کہ نااہل لوگ اپنی نااہلیت کو ٹھیک ٹھیک جان کر اس کو ہاتھ لگانے سے انکار کریں گے۔ بلکہ انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس ممانعت کے بعد نااہلوں میں اس کی مانگ اور بڑھ جائے گی۔ اور پریس بھی اس کے چھاپنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر اس کتاب کے سبب سے لوگوں میں کوئی فتنہ پھیلے گا تو اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ عنداللہ بری نہیں ہو سکتے جو ایسی ''پراسرار'' کتابوں کے

شائع کرنے والے بنے۔ پھر انھوں نے یہ غضب بھی کیا کہ لوگوں کے ذوق جستجو کو شہہ دینے کے لیے ان کتابوں پر یہ کتابہ بھی لگا دیا کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو اہل ہیں۔ اور اہل بھی کیسے، معمولی اہل نہیں، کیونکہ ان کتابوں کے اسرار و رموز سمجھنے کے لیے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء تو درکنار ابن تیمیہؒ اور ابن قیم جیسے لوگ بھی ان حضرات کے نزدیک نا اہل ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی نسبت بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ ''ارباب ظاہر اور اصحاب صحو محض ان باتوں کو کیا جانیں۔''

اس علم باطن کے ثبوت میں صاحب تحریر بزرگ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے اقوال کے اجمالاً حوالے دیے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کس قول کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے۔ اس کے اصل الفاظ کیا ہیں اور سند کے اعتبار سے اس کا حال کیا ہے؟ البتہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو یہ فرمایا کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو ظرف محفوظ کیے تھے ایک میں نے لوگوں کے درمیان پھیلا دیا اور دوسرا اگر پھیلاؤں تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔'' اس سے ہرگز ان کی مراد ارباب تصوف کا علم باطن نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں اسلامی امراء حکام کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں یا جن میں بنوامیہ کے دور کے فتنوں اور ان کے ''ملک عضوض'' کی بابت حضور نے پیش گوئیاں فرمائی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بنوامیہ کا دور اور مروان اور امراء مروان کا دور دیکھا ہے۔ ان کی وفات غالباً ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں ہوئی ہے جبکہ مسلمان بنوامیہ کے سیاسی شکنجہ میں پوری طرح کسے جا چکے تھے اور بنوامیہ تلوار کے زور سے ان تمام اہل حق کے دبا دینے کے درپے تھے جو ان کے استبداد کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے۔ انہی مستبدین کی طرف حضرت ابوہریرہؓ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر میں روزہ نماز کی حدیثوں کو بھی سناؤں جو نبی ﷺ نے موجودہ حالات کی بابت فرمائی ہیں تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔ ورنہ اگر ان کے ذخیرۂ علم میں اسی طرح کی باتیں ہوتیں جیسی ہمارے ارباب تصوف علم باطن کے نام سے پیش کرتے ہیں تو اس کے اظہار پر اگر

کوئی خطرہ ہوسکتا تھا تو حضرت عمرؓ کے دور میں ہوسکتا تھا، بنوامیہ کے دور میں ان چیزوں سے تعرض کرنے والا کون تھا؟ وہ تو ان صوفیانہ نکتوں کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کرتے تاکہ مسلمان یہ افیون کھا کر سورہیں اور انھیں پورے استبداد کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملے۔ چنانچہ ان کے دور حکومت میں ہر قسم کے جوروا ستبداد کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اس بات کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ انھوں نے کسی بزرگ سے ان کے کسی صوفیانہ نکتہ پر کبھی تعرض کیا ہو۔

تنقید کی بے اعتدالی کے ثبوت میں صاحب تحریر بزرگ نے مولانا مودودی کے ایک مضمون ''مسلک اعتدال'' کے بعض حصوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صحابہؓ اور فقہاء ومحدثین نے ایک دوسرے کے خلاف جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی تشہیر کرکے مودودی صاحب نے ان لوگوں کو شہہ دی ہے جو پہلے ہی سے صحابہؓ ومحدثین کی تحقیر کے درپے تھے۔

مودودی صاحب نے یہ ساری باتیں اپنے جی سے نہیں گھڑی ہیں، بلکہ سیر ورجال اور دین کی معتبر کتابوں سے ہی لی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب العلم میں اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محدثین ان معاملات میں اتنے نازک مزاج نہیں تھے جتنے ہمارے صاحب تحریر بزرگ ہیں ورنہ جرح وتعدیل کا وہ فن وجود ہی میں نہ آتا جس پر مسلمان ناز کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ مودودی صاحب نے ان باتوں کا ذکر کس لیے کیا ہے؟ صحابہؓ اور محدثین کی تضحیک کے لیے یا جرح وتعدیل کے صحیح نقطۂ اعتدال کو نمایاں کرنے کے لیے؟ تو اس کا اندازہ ہر شخص مضمون کا مطالعہ کرکے خود کرلے سکتا ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب اپنے مضمون میں ان باتوں کا ذکر نہ کرتے تو یہ ساری باتیں راز بنی پڑی رہتیں۔ کوئی ان کا جاننے والا دنیا میں نہ تھا۔ حالانکہ صاحب تحریر بزرگ ممکن ہے، ان باتوں سے بے خبر رہے ہوں، لیکن اس زمانے میں یہ ساری باتیں اکثر پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور منکرین حدیث تو انہی باتوں کو اچھال اچھال کر ان کو یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کررہے ہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث ہی کو دریا برد کردینا چاہیے۔ ان حالات میں شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے کی پالیسی محض

ایک احمقانہ پالیسی ہے۔ صحیح طریقہ اب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کے صحیح موقع ومحل کو واضح کردیا جائے اوران سے نقد حدیث اور جرح وتعدیل کے سلسلہ میں جوٹھیک نتائج نکلتے ہیں ان کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ اگر کوئی شخص ان باتیں پر سے گزرے تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہمیں اپنے بزرگ اسلاف کو معصوم فرشتے بنا کے بھی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بشری کمزوریوں کو رکھتے ہوئے جتنے کچھ ہیں دنیا کے سامنے ان کو اسی شکل میں پیش ہونا چاہیے۔ ان کی یہ شکل بھی اتنی خوبصورت ہے کہ دنیا کو موہ لینے کے لیے کافی ہے۔ البتہ اگر ہم نے لوگوں کو انھیں بناوٹی شکل میں دیکھنے کا عادی بنادیا تو اس سے اندیشہ ہے کہ جب کبھی تاریخ وسیر اور رجال کی کتابوں میں ان کے متعلق کچھ ناگوار باتیں لوگوں کی نگاہ سے گزریں گی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہوجائیں گے۔ آخر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جا کر دفن کریں گے کہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحب تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے امام غزالی کو حدیث میں کمزور ٹھہرایا اور امام مہدی کی علامت کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحب تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم میں بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدین حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں پہل کرکے دوسروں کے لیے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیث نقل کی ہیں جن کی ناقدین نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: یا تو امام صاحب نے عام صوفیاء کے طریقے پر پند وموعظت کے سلسلہ کی حدیثوں میں محدثانہ چھان بین کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو، یا یہ بات ہو کہ فلسفہ وتصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی تحقیق وتنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہ دیا ہو۔ بہر حال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں موجود ہیں اور اس معاملہ میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ نقد حدیث کے لگے بندھے اصول ہیں۔ اگر صاحب تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی احیاء کی حدیثوں کو تول کر دیکھ سکتے ہیں

کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔اس کے بعد اگر امام صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت وصیانت کے لیے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی وہی کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔فن کے معاملہ میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی چیز نہیں ہے۔ ناقدین حدیث اس معاملہ میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے متعلق اگر کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو صاحب تحریر بزرگ ابن خلدون کے مقدمے ہی کی بعض بحثوں پر نگاہ ڈالیں۔اس نے تمام روایات کی حیثیت واضح کردی ہے۔علامات مہدی میں سے جن جن کو مودودی صاحب نے ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے ان میں سے ہر ایک کے ناقابل اعتبار ہونے کی دلیل بھی بیان کردی ہے۔آپ ان پر شور مچانے کے بجائے ان دلائل پر تنقید فرمائیں۔

(۶) چھٹا الزام مولانا مودودی کو جماعت اسلامی کے لوگ مجدد سمجھنے لگے ہیں۔ خیریت ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے صرف مجدد سمجھے جانے ہی کا الزام لگایا ہے ورنہ الزام تو بعض حلقوں سے دعوائے مہدویت بلکہ نبوت تک کے لگائے جا چکے ہیں۔

اس معاملہ میں لوگ عجیب افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔اگر معاملہ اپنے حلقے کے کسی عالم یا شیخ طریقت کا ہو تو اس کو بے تکلف مجدد شریعت وطریقت بنا کے رکھ دیں گے،لیکن اگر معاملہ اپنے حلقہ خاص سے باہر کے کسی شخص کا ہو تو اس کا کوئی قدرداں چاہے کتنے ہی ہلکے الفاظ میں اس کی دینی خدمات کی تحسین کرے،ان حضرات کے دل پر اس کی سخت چوٹ پڑتی ہے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی گنجائشیں نکالنے لگتے ہیں کہ اس پر اور اس کے قدردانوں پر کوئی الزام چسپاں کیا جاسکے تاکہ اور کچھ نہیں تو بدنام ہی کر کے دل ٹھنڈا کرلیا جائے۔یہ حضرات دین اور دینی معاملات کو اپنا اجارہ سمجھتے ہیں اور یہاں کسی اور کا چراغ جلتے دیکھنا ان کے لیے ناقابل برداشت ہے۔؟

تجدید اور مجدد کے معاملے میں میرا نقطۂ نگاہ اوروں کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔اس امت میں چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں ہے،نبوت کا منصب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم

ہو چکا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر شریعت کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دینے کے واسطے دو خاص انتظام فرمائے ہیں: ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریفوں سے ہمیشہ کے لیے مامون کر دیا۔ اگلی امتوں کے صحیفوں میں جس طرح کی تحریفات واقع ہو گئیں اور جس کے سبب سے وہ نئے نبیوں کی بعثت کی محتاج ہوئیں وہ بات اس امت کو نہیں پیش آئے گی۔ دوسرا یہ کہ اس امت میں ایسا فساد کبھی واقع نہیں ہوگا کہ اس کے اندر حق کی حامل کوئی جماعت سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں اور آں حضرت ﷺ نے بھی نہایت واضح الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اسلام غربت (اجنبیت اور بے کسی) کی حالت میں شروع ہوا اور یہی حالت اس پر پھر لوٹ آئے گی، مبارک ہیں وہ جو اجنبی سمجھے جائیں کیونکہ وہ لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں یہ مضمون ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور حق کے مخالفین اس کو اقامت حق کے کام سے روک نہ سکیں گے۔ (او کما قال)۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ جب اس امت میں اس طرح فساد سرایت کر جائے گا جس طرح اس شخص کے جسم میں زہر سرایت کر جاتا ہے جس کو باولے کتے نے کاٹ کھایا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو فساد سے محفوظ رکھے گا۔

یہ تمام حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت کے اندر صالحین و مصلحین اور دین حق پر قائم رہنے والوں اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرنے والوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ مجددین اور مصلحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر "من یجدد لھا دینھا" والی حدیث میں آیا ہے۔ لیکن چونکہ اس حدیث میں 'مأۃ' کا لفظ آیا ہے جو دور اور صدی دونوں معنوں کے لیے آتا ہے، نیز 'من' کا لفظ آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لیے عموماً لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے 'مأۃ' کو صدی کے معنیٰ میں اور 'مَنْ' کو واحد کے مفہوم میں لیا اور یہ سمجھے کہ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ کسی خاص شخص کو

بھیجتا ہے جو اس صدی کا مجدد بن کر آتا ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے جو اس دور میں خدا کے دین کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ بعینہٖ اس مضمون کا دوسرے الفاظ میں اعادہ ہے جو اوپر کی حدیثوں میں گزر چکا ہے، نہ اس سے کچھ مختلف ہے اور نہ اس مضمون پر ایک حرف کا اضافہ ہے، لیکن لوگ ''مأۃ'' اور ''من'' دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی کر جانے کی وجہ سے خواہ مخواہ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ قطع نظر اس سے کہ اس غلط مطلب نے بہت سے کمزور نفوس کے اندر وسوسہ اندازی کی اور وہ مجددیت کے خواب دیکھنے لگے۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے ہر صدی کے آغاز و اختتام پر ایک مجدد کی تلاش شروع کر دی۔ اور اگر کوئی اہل آدمی نہ مل سکا تو اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کسی نا اہل ہی کو اس مسند پر لا بٹھایا کہ بہر حال جگہ خالی نہیں رہنی چاہیئے۔[1]

میرے نزدیک مجدد والی حدیث کا مفہوم وہی ہے جو دوسری حدیثوں میں بیان ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر دور میں مصلحین و مجددین کی ایک جماعت کو برپا رکھے گا جو اللہ کے دین پر خود بھی قائم رہے گی اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہے گی۔ اس جماعت کی خاص پہچان یہ ہوگی کہ یہ رسول اور صحابہ کے طریق کار پر گامزن رہے گی اور اقلیت میں ہونے کے باوجود باطل سے کشمکش کرتی رہے گی۔

جہاں تک اس مسئلہ کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ باقی رہا خاص مودودی صاحب کا معاملہ تو میں ان کو اس سے اونچا سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کے کسی وسوسے میں مبتلا ہوں۔ وہ ایک دانشمند اور خدا ترس آدمی ہیں اور راہ حق کی آزمائشوں اور صعوبتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ خدا کے ہاں پہنچنے سے پہلے ہی

---

[1] بعینہٖ یہی بات مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے فرمائی ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ ہر صدی میں مجدد کا مبعوث ہونا ثابت ہے، اس صدی کا مجدد کون ہے؟ جواب میں فرمایا: ''ہر وقت میں جو علماء قامع بدعت اور محی سنت ہوں ان کا مجموعہ مراد ہے۔ جو شخص بایں طرح ہو اس مجموعے کا ایک جزو خیال کرنا چاہیے۔ اور جن لوگوں نے ایک کو قرار دیا ہے ان کو سخت مصیبت پیش آئی۔ ہر چند تاویلات کی گئیں تاہم درست نہیں ہوا۔ (فتاوی رشیدیہ حصہ دوم ص:۵۲)

اپنے مرتبے اور درجے کا فیصلہ کرنے کی جسارت کریں گے[1] جماعت کے اندر اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو مجدد خیال کرتے ہیں تو میں ان کو بھی یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس فیصلہ میں جلدی نہ کریں جب تک ایک شخص زندہ ہے وہ فتنوں سے مامون نہیں ہوسکتا۔ کیا خبر جس شخص کو آپ آج اس صدی کا مجدد ثابت کرتے ہیں کل کو وہ کس کیمپ میں ہو اور آپ کس کیمپ میں ہوں پھر جو باتیں خدا کے فیصلہ کرنے کی ہیں آپ ان کا فیصلہ کرنے والے کون؟ کسی شخص کے مجدد ہونے کے لیے تنہا یہی بات تو کافی نہیں ہے کہ اس نے آپ کے نقطۂ نظر سے تجدید و اصلاح کی کوشش کی، اس کے ساتھ ساتھ اس کا خلوص اور اس کی نیک نیتی بھی تو مطلوب ہے جس کا فیصلہ بہر حال ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ خدائے علام الغیوب ہی کر سکتا ہے۔

(۷) آخری الزام جو صاحب تحریر بزرگ نے مولانا مودودی اور ان کے رفقاء پر لگایا ہے وہ فوٹو کھنچوانے کا ہے۔ یہ الزام بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد مولانا مودودی کے ایک دو فوٹو بعض اخباروں میں ضرور چھپے ہیں لیکن ان کے کھینچے جانے یا ان کے شائع ہونے میں مولانا کی مرضی یا ان کے علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کھینچنے والوں نے کھینچا اور چھاپنے والوں نے چھاپ دیا۔ اس کے عذاب و ثواب کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ مولانا مودودی اخلاقی اعتبار سے اتنے بودے آدمی نہیں ہیں کہ ایک طرف تو تصویر کھنچوانے اور اس کے شائع کرانے کی حرمت کا فتوا دیں، دوسری طرف اپنے ساتھیوں کو لے کر فوٹو کھنچوانے کھڑے ہو جائیں۔

---

[1] ان کا اپنا بیان اس سلسلے میں یہ ہے، جواب سے کئی سال پہلے ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہو چکا ہے:۔ ''اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہوسکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ **اجتنبو اکثیراً من الظن ان بعض الظن اثم**)۔ جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگان خدا کو جماعت اسلامی کی دعوت حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے۔ اور وہ سزا یہ ہے کہ ان شاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی اور ان کو بیان کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔''

صاحب تحریر بزرگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کے بارے میں جس حسن ظن سے کام لینے کے عادی ہیں اگر اس کے دسویں حصہ حسن ظن سے بھی اس معاملے میں کام لیتے تو ایک مسلمان کے متعلق وہ اس بدگمانی میں نہ مبتلا ہوتے۔ لیکن یہ عجیب دردانگیز صورتحال ہے کہ جہاں معاملہ اپنے حلقے سے باہر والوں کا ہوتا ہے وہاں تو یہ حضرات مچھر کو بھی چھاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر معاملہ اپنوں کا ہوتو اونٹ تک نگل جائیں گے۔



جوابِ تتمّہ

صاحب تحریر بزرگ نے اپنے اس مضمون کا ایک تتمہ بھی تحریر فرمایا ہے اور اس تتمہ کو ''روحِ مضمون'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ہمارے نزدیک بھی اس ٹکڑے کی حیثیت فی الواقع یہی ہے۔ ان کے طول طویل مضمون سے بھی ان کا باطن اتنی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب نہیں ہوسکا تھا جتنی خوبی کے ساتھ ان کی ان چند سطروں میں وہ بے نقاب ہوگیا ہے۔ وہ ان سطروں میں اپنا باطن ہی بے نقاب کرنے پر مجبور نہیں ہوگئے ہیں بلکہ انھوں نے ہماری دعوت کا وہ باب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے جو اتنے نمایاں طور پر ہمارے سامنے یا تو آیا ہی نہیں تھا یا آیا تھا تو ہم نے اس کو اچھی طرح پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مولانا صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز بیان میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ مقبول خدا ہوتے ہیں ان کی مقبولیت کا آغاز خواص سے ہوا کرتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ وہ پہلے عوام کالانعام میں مقبول ہوں اور اس کے بعد خواص ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اس اصول کو قائم کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مودودی صاحب کوئی مقبول خدا آدمی ہرگز نہیں ہوسکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اقامت دین کے نام سے جو دعوت شروع کر رکھی ہے اس میں صرف ان لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے جو کل تک یارائے سے کورے تھے یا یمین میں کورے، علم

وفکر سے عاری تھے یا تقویٰ وتورع سے فارغ، ختم نبوت میں مذبذب تھے یا خاکساریت کے علمبردار، نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کا شکار، وہی متوجہ ہورہے ہیں۔ اہل علم وتقویٰ گویا روشناس ہی نہیں یا مدارس عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانہ تحصیل میں بھی بخاری بدوش اور کمیونزم بکف تھے۔''

مولانا صاحب کی یہ سطریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی ہے اور دعوت دین کا ہر دور ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ واقع ہوا ہے۔

جو طعنے آج مولانا صاحب جماعت اسلامی کے خادموں کو سنا رہے ہیں بعینہٖ یہی طعنے کم وبیش انہی الفاظ میں ان لوگوں کو سنائے گئے تھے جنھوں نے اگلے زمانوں میں نبیوں اور رسولوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ طعنے دینے والے اپنی نسبت بعینہ وہی رائے بھی رکھتے تھے جو مولانا صاحب اپنی نسبت اور اپنے زمرے کے دوسرے بزرگوں کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کے زمانوں میں جن لوگوں نے دعوت حق کا ساتھ دیا اور ان کو ان کے زمانے کے ''اکابر'' کی زبان سے یہ طعنہ سننا پڑا کہ یہ ''اراذلنا بادی الرای'' حقیر اور رائے سے کورے ہیں'' حضرت مسیح علیہ السلام نے جب دعوت حق بلند کی تو وہ تمام علماء یہود جو ''علم وعمل، فکر واخلاص، تبحّر وتدین، رائے اور یمین کے اعتبار سے عظیم القدر ہونے کے مدعی تھے'' وہ بالکل غیر متوجہ رہے۔'' اور جن چند غریبوں نے ان کا ساتھ دیا ان کو ان ''اہل علم وتقویٰ'' حضرات نے سفہاء یعنی جاہل اور علم وفکر سے عاری قرار دیا۔ اس لیے کہ وہ غریب مشیخت کی گدیوں اور درس وافتاء کی مسندوں سے ناآشنا، دریا کے کنارے کے ماہی گیر تھے۔ اسی طرح ان غریبوں کو ''تقویٰ اور تورع سے فارغ'' بھی قرار دیا گیا۔ اس لیے کہ علماء حضرات کو ان سے یہ شکایت تھی کہ یہ کبھی کبھی ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھالیتے ہیں۔ انہی بزرگوں کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ'' کتنے ہیں جو آگے تھے وہ پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے

ہیں جو پیچھے تھے وہ آگے ہو جائیں گے۔''

آں حضرت ﷺ نے جب دعوت حق بلند کی تو مکہ اور طائف کے تمام اکابر جو صاحب الرائے سمجھے جاتے تھے اور قریش کے تمام صنادید جو بیت اللہ کی مختلف گدیاں سنبھالے ہوئے تھے بالکل ''غیر متوجہ رہے اور صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ کچھ سر پھرے چھوکروں اور کچھ غلاموں نے یہ سارا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے۔ بزرگوں میں سے کوئی اس فتنے میں شریک نہیں ہے۔ یہود کے علماء نے بھی آگے بڑھ کر انہی لوگوں کی تائید کی اور کہا کہ یہ کچھ سفہاء یعنی ''فکر و رائے سے عاری'' لوگ ہیں جو محمدؐ کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اگرچہ ہمارے حقیر کام کو انبیاء علیہم السلام کے عظیم کام سے وہی نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے اور ہماری شخصیتوں کا تو ان سے کوئی مقابلہ نہیں ہے لیکن دونوں کے مخالفین کے لب و لہجے کی اس یکسانی اور ان کی ذہنیت کی اس مشابہت کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ خیال ضرور گزرتا ہے ع

گرچہ خردیم نسبتیست بزرگ

اصل یہ ہے کہ آدمی جب تک حق کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کے طریقے سے پہچاننے کے بجائے اشخاص و افراد کے ذریعے سے پہچاننے کی کوشش کرے گا اس پر حق کی راہ کبھی کھل ہی نہیں سکتی۔ اس ذہنیت کے لوگ اپنے آگے چلنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ کسی کے پیچھے آنکھ بند کر کے لگ گئے ہیں اسی طرح حق بھی دست بستہ ان کے پیچھے پیچھے لگ گیا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ ان کی پیروی کے سوا حق کو پانے کا کوئی اور ذریعہ مل سکے۔ اسی ذہنیت کے لوگوں نے مسیح علیہ السلام کے زمانے میں علمائے یہود کا ساتھ دیا۔ اس لیے کہ بہر حال ''خواص'' کی حیثیت یروشلم کے ان پشتینی دینداروں ہی کو حاصل تھی

نہ کہ دریا کے کنارے کے ان ماہی گیروں کو جنھوں نے مسیح علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح اس زمرے کے لوگوں نے محمد ﷺ کے زمانے میں مکہ اور طائف کے اکابر کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ راست رو (اھدی) قرار دیا، اس لیے کہ وقت کے خواص اور اصحاب الرائے وہی تھے نہ کہ صہیبؓ وسلمانؓ جو وقت کے اکابر کی نگاہوں میں اراذلنا بادی الرای کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم اس ذہنیت کے لوگوں سے ہمیشہ مایوس رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دعوت میں کبھی ان کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ واضح سے واضح حق کو بھی قبول نہیں کر سکتے اگر وہ ان کے پاس ان کے اکابر کے واسطے سے نہ آئے اور غلط سے غلط بات کو بھی اختیار کر لیں گے اگر ان کے اکابر اس کی علمبرداری اختیار کر لیں یا کم از کم اس کی تصدیق ہی کر دیں۔ اس لیے ہم نے اپنا مخاطب براہ راست انہی سے رکھا ہے جو موجودہ سوسائٹی کی قیادت فرما رہے ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا تعلق علماء کے طبقے سے ہو یا اہل سیاست کے طبقے سے۔

مولانا صاحب نے حدیث کا یہ مطلب تو بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ کسی دعوت حق کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کرنے والے ہمیشہ ''خواص'' ہی ہوتے ہیں۔ لیکن ان خواص کی پہچان کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ رسمی دینداری کی موروثی گدیوں کے وارث ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ درس و افتاء کی مسندوں پر سرفراز ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ لمبی لمبی عبائیں پہنتے ہیں اور ربی اور عالم کہلانا پسند کرتے ہیں؟ کیا یہ کہ جب وہ بازاروں میں نکلتے ہیں تو لوگ ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں؟ یقیناً مولانا تسلیم کریں گے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو کسی شخص کے خواص میں سے ہونے کی دلیل قرار دیا جا سکے۔ پھر غور کرنا چاہیے کہ خواص کی پہچان ہے کیا؟ حق کے قبول کرنے والے خواص کے اوصاف جہاں تک قرآن وحدیث سے میں سمجھ سکا ہوں، میں نے اپنی کتاب ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اس کتاب کا وہ باب ضرور ملاحظہ فرمائیں جو دعوت حق کے موافقین اور مخالفین سے

متعلق ہے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ ان خواص کی کیا شناخت ہے جو کسی دعوت کو قبول کیا کرتے ہیں۔

یہاں تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن میں حق کو قبول کرنے والے خواص کے چند اوصاف کا اجمالاً ذکر کروں گا جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں:

ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے گروہی تعصّبات اور آبائی تقیدات سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔

ان کی دوسری صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اندھی تقلیدی کی بیماری سے پاک ہوتے ہیں، دوسروں کے پیچھے چلتے ہوئے خود اپنی آنکھیں بھی وہ کھلی رکھتے ہیں۔

وہ حق کی کسوٹی صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو مانتے ہیں اشخاص کو حق و باطل کا معیار نہیں بناتے۔

اخلاقی اعتبار سے سوسائٹی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ پست ہمت، ضمیر فروش اور خودغرض نہیں ہوتے اور نہ باطل کا مقابلہ کرنے میں بزدل ہوتے ہیں۔

وقت کے نظام باطل سے ان کی وابستگی اگر ہوتی بھی ہے تو خودغرضانہ نہیں ہوتی۔

وہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اپنی ذات اور اپنے حلقے سے باہر نہ کسی خیر کا تصور کرسکیں اور نہ کسی کی رہنمائی قبول کرسکیں۔

یہ علامات ہیں جو قرآن مجید میں ان لوگوں کی بیان کی گئی ہیں جو حق کو قبول کیا کرتے ہیں اور جن کو قرآن حق کے ''خواص'' میں سے شمار کرتا ہے۔ مولانا صاحب اگر ان کسوٹیوں پر جماعت اسلامی کے ارکان کو جانچیں گے تو مجھے امید ہے کہ وہ ان کو ان شاء اللہ موجودہ سوسائٹی کا مکھن ہی پائیں گے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ان کے اندر ہر گروہ اور ہر طبقے کے افراد شامل ہیں۔ ان میں وہ

بھی ہیں جو انگریزی درسگاہوں کی قتل گاہوں سے بچ کر آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو عربی مدرسوں کے قبرستانوں سے نکل کر آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو وقت کی مختلف تحریکوں سے متاثر رہے ہیں، وہ بھی ہیں جو مذہبی گروہوں اور حلقوں سے کسی نہ کسی نوعیت سے وابستہ ہیں۔ ہر طرح کے لوگ اس جماعت میں آ آ کے شامل ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے اندر وہ خوبیاں ضرور رکھتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں اور وہی خوبیاں تھیں جو اس کو اس دعوت کی طرف کھینچ کے لائیں، جو اقامت دین کے لیے اس کے سامنے بلند کی گئی۔ آپ حضرات اگر ان کو سفہا، اور اراذلنا بادی الرائے کہتے ہیں تو شوق سے کہیں، ہم اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو دونوں کو حق پر چلنے والا بنائے اور کبر و غرور کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

